شمارہ ۰۷، جلد ۰۱، ۲۰۲۵

*Article*

# Research Perspectives of the Ghalib Era

## عہد غالب کے تحقیقی زاویے

**Dr. Qasim Yaqub**
Assistant Professor, Department of Urdu, Allama Iqbal Open University, Islamabad
Correspondence: qasim.yaqoob@aiou.edu.pk

**ڈاکٹر قاسم یعقوب**
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

**eISSN**: 2707-6229
**pISSN**: 2707-6210
Received:30-06-2025
Accepted:15-07-2025
Online:31-08-2025

**Copyright:** © 2025 by the authors.

This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

**ABSTRACT**
This article analyzes the personality of Ghalib and the historical, social, and cultural context of his era. It explores how Ghalib's inner traits were shaped by external influences, and how his thoughts often diverged from political events. The writer highlights Ghalib's family background, shifting state politics, and the impact of British colonialism, showing that cultural awareness was more prominent than national identity at the time. The article demonstrates that Ghalib interpreted history and politics through an objective, rational lens rather than emotion or bias. Overall, Ghalib is portrayed as a conscious and realistic thinker who understood the complexities of his age in a nuanced way.

**KEYWORDS:** Historical Change, Ghalib's Poetry, Mughal Decline, British Arrival, War Of 1857, Aristocracy, Intellectual Thought, Social Reforms, Individual-Society Connection

ذات کا شخصیت اور حقیقت کا شخصیت کے ساتھ انسلاک اور تصادم ایک دلچسپ مطالعہ ہے۔ ذات کی صفات جب شخصیت میں ظاہر ہوتی ہیں تو ان کی شکل بدل جاتی ہے۔ ذات کلی تصور کا نام ہے جب کہ شخصیت شخص کے اُن رجحانات کا عکس ہے جو اُس کے اعمال یا افعال سے ظاہر ہوتے ہیں۔ دونوں کو ایک ہی سمجھنا یا ایک کو دوسرے کے حوالے سے سمجھنا غلط فہمی کا باعث

بن سکتا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ جو قول ہے اُسی کے مطابق فعل ہو اور جو فعل ہو اس کا عکس قول میں بھی ہو۔ البتہ شخصیت کو اُس کے سماجی واقعات کے تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ شخصیت اور واقعہ دونوں خارج میں دکھائی دیتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں۔ خود آگہی اپنے بارے میں جاننا ہے جب کہ خود احساسی اپنے آپ کو دوسروں پر ظاہر کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں خود آگہی یہ احساس بھی دیتی ہے کہ دوسرے اُس کے بارے میں کیا آگہی رکھتے ہیں، دوسروں کا خود کے بارے میں احساس خود احساسی کہلاتا ہے۔

غالب پر گفتگو سے پہلے ہمیں اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ 'ذات' ایک ایسی حقیقت ہے جس تک مکمل رسائی ممکن نہیں۔ کسی فرد کی ذات کس طرح اس کی شخصیت میں ڈھلتی ہے اور یہ شخصیت دوسروں پر کیسے ظاہر ہوتی ہے، اسے پوری طرح سمجھ لینا آسان نہیں۔ اس حوالے سے ہم صرف خارجی شواہد اور قیاسات کی مدد سے جزوی فہم حاصل کر سکتے ہیں۔

غالب کون تھا؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہمارے پاس دو بنیادی ذرائع موجود ہیں: غالب کی زندگی اور اس کا کلام۔ سرسری نظر ڈالیں تو ان دونوں میں تضاد نظر آتا ہے۔ اگر ہم شعرِ غالب کی تفہیم صرف خارجی واقعات کی روشنی میں کرنا چاہیں، تو ہمیں واقعات کو محض تاریخی یا وقتی تناظر میں نہیں بلکہ زمانے، ثقافت، شخصیت اور داخلی کیفیات کے باہمی امتزاج سے پیدا ہونے والی ایک غیر مرئی دنیا کے تناظر میں دیکھنا ہو گا۔ غالب صرف وہ نہیں جو سوانحی حوالوں میں بکھرا پڑا ہے بلکہ وہ ایک ایسی فکری کائنات کا حصہ ہے جو وقت کی تبدیلی، اسلوب کی ساخت اور فکری دھاروں کے نشیب و فراز سے بنتی ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم فکری منجدھار میں یکسوئی کے ساتھ اُتریں۔ یہ منجدھار اور یکسوئی کا ملاپ، ایک مشکل عمل ہے۔ ہر واقعہ اپنے اندر کئی فکری، سماجی اور لاشعوری سطحوں سے جڑا ہوتا ہے۔ ایک واقعے کو صرف ایک جہت سے دیکھنا اس کی مکمل تفہیم نہیں دے سکتا۔ بہت سی کڑیوں کو آپس میں جوڑنے سے بعض اوقات ایک مطلب سامنے آ سکتا ہے، لیکن وہ ایک مطلب بھی حقیقت کا مکمل احاطہ نہیں کرتا۔ معنی ہمیشہ جزوی ہوتے ہیں اور مکمل سچ تک رسائی ایک مسلسل، پیچیدہ اور ادھورا سفر ہے۔

زمانہ یک دم تبدیل ہوتا ہے اور نہ ہی سماج میں تبدیلی کا عمل کسی ایک رُخ سے آغاز کرتا ہے۔ تبدیلی کا سفر اندر، باہر، دائیں، بائیں ہر طرف سے زمانے کی ہیئت پر حملہ آور ہوتا ہے۔ ایک تسلسل سے جاری عمل میں ایک چیز نہیں بلکہ پورے نظام کا تشکیلی ڈھانچہ بدل رہا ہوتا ہے۔ البتہ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ شاید کسی ایک چیز، واقعہ یا شخص کی وجہ سے تبدیلی کا پیش خیمہ بنا ہے۔ برصغیر میں انگریزوں کا غاصبانہ قبضہ محض تجارتی یا سیاسی سطح کا معاملہ نہیں تھا۔ اس کے پس منظر میں ایک نیا زمانہ کروٹ لے

رہا تھا۔ اس یک دم بدلتی اقدار کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے اُس زمانے کی سماجی بصیرت کو سمجھنا ضروری ہے۔ اکیسویں صدی میں بیٹھ کر جب ہم ماضی کے دھندلکوں میں جھانکتے ہیں تو ہمیں اشیا، واقعات یا شخصیات تنہا(Obstruct) نہیں دکھائی دیتیں، بلکہ ان کے ساتھ نظریاتی تعصب کا غبار بھی لپٹا ہوا مِلتا ہے۔ مثلاً مرہٹوں کی ریشہ دوانیاں، جاٹوں کے حملے، پلاسی اور میسور کی جنگیں اُس وقت کسی نظریے کے تابع ہوں نہ ہوں مگر آج ہم انھیں قومیت(Nationalism) کے بغیر جانچ ہی نہیں سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم آج یعنی حال میں کھڑے ہیں، جہاں علاقائی و قومیتی نظریے، لسانی تفریقی شعور، مذہبی شناختوں کا بحران وغیرہ اپنے عروج پر ہے۔ جس طرح ماضی حال کو بدلنے کی قوت رکھتا ہے، اسی طرح حال ماضی کو بھی بدلتا ہے۔ وقت کے ساتھ جو جو تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں انھیں نئے نظریاتی عدسوں کی مدد سے دیکھنے کا عمل جاری رہتا ہے۔ اس سے ماضی جامد شے کی بجائے ایک متحرک شے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

جنگِ پلاسی کو انگریزوں کی آمد کا باعث قرار دیا جاتا ہے مگر اس واقعے کے پس منظر میں ایک نئے عہد کی بنیاد پڑنے کا عمل بھی پوشیدہ ہے۔ بہت سے واقعات اور اقدار جو ریزہ ریزہ سماج کے بدن سے جھڑ رہی تھیں، یک دم کسی عمارت کے دھڑام سے گرنے کے منظر میں بدلتی ہیں۔ "پلاسی" کے واقعے کی کھوکھ سے نئے زمانے کا ظہور ہوتا ہے۔ سراج الدولہ کے عقوبت خانہ کو انگریزوں نے بلیک ہول قرار دے کے، یہاں سے اقتدار کا الائو روشن کرنے کا عہد کیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورا برصغیر انگریزوں کے بجلی کے چراغوں سے روشن ہونے لگا۔ سراج الدولہ کا بلیک ہول تاجِ برطانیہ کا روشن غار بن گیا۔ انگریزوں کی آمد کے یہی ابتدائی محرکات برصغیر میں تہذیبی تبدیلیوں کو سمجھنے میں اہم ہو سکتے ہیں۔ سراج الدولہ، جو ۲۳ سال کی عمر میں بنگال کا حکمران بنا اور ایک سال کے بعد ۲۴ سال کی عمر میں انگریزوں کے ہاتھوں شکست کھا کے مارا گیا، کی مزاحمت برصغیر میں نئی صبح کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ جنگ پلاسی کی جنگ کے بعد انگریزوں نے سینکڑوں سال تک ایک متھ پھیلائی رکھی، جو برصغیر کو نو آبادی بنانے کا جواز بناتی رہی کہ سراج الدولہ نے 'بلیک ہول کلکتہ' میں ۱۲۳ انگریزوں کو بے دردی سے قتل کیا تھا جب کہ اسی جنگِ پلاسی کے ایک کردار میر جعفر نے انگریزوں کے ساتھ اقتدار کی ساز باز کی اور والی بنگال کو دھوکہ دے کر انگریزوں کے لیے راستہ ہموار کیا۔(۱)

میر جعفر کے ذریعے جس طرح سراج الدولہ کی شکست اور پھر اس کے بیٹے میرن کے ہاتھوں قتل کو برصغیر میں سماجی و سیاسی تبدیلی کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے، اگر ہم تھوڑا سا پیچھے جا کے دیکھیں تو ۱۷۴۰ء میں سراج الدولہ کا دادا علی وردی خان خود بھی ناصری خاندان کے مسلم حکمران سرفراز خان کو شکست دے کر تختِ اقتدار پر براجمان ہوا تھا۔ چوں کہ یہ مقامی نوابوں کی لڑائیاں

تھیں اس لیے ہم انھیں نظر انداز کر دیتے ہیں، مگر انگریزوں کے سراج الدولہ کے ساتھ معرکے میں مقامی حکمران نواب کی شکست کو ہم قومی نظریاتی عینک سے دیکھتے ہیں جس سے یہ جنگ محض ایک لڑائی نہیں رہ جاتی بلکہ قومی اقدار کی فتح و شکست کا نظریہ بن جاتی ہے۔اس حقیقت کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جونہی انگریز بنگال میں قبضہ کرنے میں کامیاب ہوا دہلی میں بیٹھا بادشاہ شاہ عالم اس تمام علاقے کا محاصل جو لاکھوں روپے تھا انگریز جرنیل رابرٹ کلائیو کو دے دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں پورا علاقے کی خود مختاری مقامی مغل حکمرانوں سے لے کر انگریزوں کو سونپ دی گئی۔شاہ عالم ثانی نے بنگال، بہار اور اڑیسہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو "الہ آباد معاہدہ" کے تحت یہ حقوق دیے۔شاہ عالم ثانی احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں دلی سے بے دخل ہو کے الہ آباد میں پناہ گزیں تھا۔ انگریزوں کو حقوق نہ دیتا تو اور کیا کرتا۔میر جعفر کی غداری سے بڑا واقعہ یہ تھا کہ شاہ عالم ثانی نے ایک معاہدہ کے تحت انگریزوں کو باقاعدہ راستہ فراہم کر دیا کہ وہ آئیں اور محاصل اکٹھا کرنا شروع کریں۔ اس سے بھی بڑھ کے شاہ عالم نے انگریزوں سے ۲۶ لاکھ روپے سالانہ پنشن بھی لینا شروع کر دی۔(۲) ابھی تک برصغیر میں کسی قومیتی نظریے کو فروغ نہیں مل پایا تھا۔جوں جوں انگریزوں اور مقامی باشندوں کے درمیان تفریق بڑھتی گئی، توں توں قومی تصور بھی جڑ پکڑتا گیا۔

کہتے ہیں کہ سراج الدولہ نے جب کلکتہ کے قلعہ ولیم کی دیواریں اونچی کرنے پر ناراضی کا اظہار کیا تو یہیں سے برصغیر کی تاریخ بدلنا شروع ہو گئی تھی۔انگریز تاجر جس بھی نیت سے اس قلعے کی دیواریں اونچی کر رہے تھے۔ تاریخ نے دیکھا کہ اس قلعے نے نئی لسانی، فکری اور تہذیبی عمارت بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ سراج الدولہ کو اگر رات جگا دیا جاتا تو شاید انگریز سویا رہتا۔جب نواب صبح بیدار ہوا تو اس وقت ایک چھوٹے سے کمرے میں قید ۱۴۶ انگریز قیدیوں میں سے صرف ۲۳ زندہ بچے تھے۔ انگریزوں نے اس واقعے کو بلیک ہول آف کلکتہ قرار دیا اور حملے کے لیے تیاری پکڑنے لگے۔ جنگِ پلاسی اسی تلخ واقعے کے پس منظر میں لڑی گئی۔(۳)

برصغیر کی سیاسی تاریخ کو قومی حریت کے پس منظر میں دیکھنے کا رجحان انیسویں صدی کے ربع آخر کا ہے۔جنگِ پلاسی کلکتہ سے ستر کلو میٹر باہر پلاسی کے مقام پر لڑی گئی جب کہ اس سے پیشتر جنگیں دہلی سے ۱۰۰ کلو میٹر باہر پانی پت کے مقام پر لڑی جاتی تھیں۔پانی پت کا میدان صدیوں سے مشرقی اقوام کے برصغیر کے مغربی دروازے سے آنے والی فوجوں کا دارالحرب بنتا رہا تھا، مگر اس بار مشرق میں پلاسی کا علاقہ مغربی قوم کے مشرقی دروازے کا دارالحرب بن گیا۔

یہاں با آسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سراج الدولہ اور انگریزوں سے لڑائی دو طاقت ور متحارب گروہوں کی لڑائی تھی

جس میں میر جعفر نے سیاسی چال چلی۔ شاہ عالم نے بکسر کی جنگ کے بعد لارڈ کلائیو سے الہ آباد معاہدہ کر کے پنشن لینا شروع کر دی۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا گیا تھا کہ یہ وہی شاہ عالم ثانی ہے جو ایک اور افغانی حملہ آور احمد شاہ ابدالی سے شکست کھا کے الہ آباد بھاگ گیا تھا۔ کیا ان تاریخی حقائق کو کسی قومی نظریاتی سانچے میں رکھا جا سکتا ہے؟ اصل میں یہ سب اقتدار کے ایوانوں کے درمیان جنگی معرکے تھے جس میں کوئی ایک فریق جیتا اور کبھی دوسرا۔ ہم آج انھیں غداری، قومی غیرت اور حب الوطنی غیرت کے تقاضوں پر ماپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ اُس وقت اجتماعی قومی تصورِ حیات موجود نہیں تھا۔

غالب کے پیدائش سے کچھ عرصہ قبل مغل اور مرہٹوں کا گٹھ جوڑ اور روہیلوں کے ساتھ خون ریز جنگوں کا احوال یاد رکھنا چاہیے۔ یہاں ایسا کوئی بھی حب الوطنی کا قومی تقاضا نہیں تھا۔ یہی وہ زمانہ (۱۷۶۰ء سے ۱۷۸۰ء کے درمیان) ہے جب غالب کے دادا قوقان بیگ سمرقند سے ہجرت کر کے برصغیر وارد ہوئے۔ اس وقت پورا سماج کروٹ لے رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی راجدھانیوں کے مالک نواب آپس میں اُلجھ رہے تھے۔ مغل سلطنت کے جاہ و جلال کا اثر ہو چکا تھا۔ یہاں یہ بات بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کہ برصغیر میں تبدیلی کی نوعیت کوئی ایک نہیں تھی۔ یہ تبدیلیاں تین سطحوں پر جاری تھیں:

۱۔ انتظامی ریاستی ڈھانچوں میں توڑ پھوڑ

۲۔ سماجی زندگی میں نئی اقدار و ایجادات کا ظہور

۳۔ فکری سطح پر نظریات و عقائد میں تصادم

تینوں الگ الگ مگر ایک ہی خطے (ہندوستان) میں واقع ہو رہی تھیں۔ فکری اور ثقافتی تبدیلیوں کو فوری سمجھا نہیں جا سکتا تھا۔ عموماً کسی سماجی ڈھانچے میں جو تہذیبی اتار چڑھاؤ آ رہا ہوتا ہے وہ فوری ظاہر نہیں ہوتا۔ زیرک اور دانش ور اذہان پہچان تو لیتے ہیں مگر اُس کی تشکیلی حالتوں تک پہنچنے میں ناکام رہتے ہیں۔ کیوں کہ یہ تبدیلیاں پہلے پہل لاشعوری اور غیر سیاسی ہوتی ہیں اور رفتہ رفتہ سماجی واقعات میں ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ انگریزوں کی آمد سے پیدا ہونی والی تہذیبی تبدیلیاں کھل کے ۱۸۵۷ کے بعد سامنے آنا شروع ہوئیں۔

غالب جس خاندان (ماحول) سے تعلق رکھتے تھے، وہ قومی شعور کی بجائے تہذیبی شعور کے قریب تھا، جس میں تبدیلی آنا اُس وقت ممکن نہیں تھا۔ غالب کے دادا، والد، چچا اور سسرال کا سارا خاندان سیاسی سطح پر مختلف ریاستوں کے رئیس زادوں اور طاقت ور حلقوں سے بطور معاش جڑا ہوا تھا، لہٰذا اس خاندان کے ماحول ہی میں یہ چیز شامل نہیں تھی کہ سیاسی وابستگیوں کے تسلسل میں تہذیبی انتشار کو پہچانا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ غالب نے انگریزوں سے وظیفہ لینے اور معاش کے لیے مغل درباروں

تک رسائی حاصل کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی۔ تہذیبی سطح پر وہ انسان کے اُس مقام کو پوری طرح پہچان رہے تھے جس میں دہانِ زخم پیدا کر کے ہی راہِ سُخن واہ ہوتا ہے، مگر سیاسی واقعے سے اُن کی توجہ غیر معمولی طور پر منقطع رہی۔

سیاست و قوعے اور تہذیبی اقدار دو الگ الگ خانوں میں دیکھنے کا رویہ محض غالب کے ہاں ہی نہیں بلکہ عام رجحان تھا۔ فرد نے اپنی کسی بھی سیاسی گروہ سے قومی یا نظریاتی طرز کی مفاہمت پیدا نہیں کی تھی۔ عام آدمی کی زندگی دربار کے سیاسی نظام سے بہت مختلف تھی۔ سکھ، مرہٹوں، روہیلے پٹھان، مغلوں، انگریزوں اور جاٹوں کی درجنوں ریاستوں میں اقتدار اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ برصغیر کا سیاسی نظام، ذات پات، مذہبی تفریق اور قومی تعصب وغیرہ کا کوئی شعور نہیں رکھتا۔ اُس وقت یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ قومی اور علاقائی حب الوطنی کا شعور بیسویں صدی کی پیداوار ہے جب سراج الدولہ کو انگریزوں کے خلاف دھرتی کا ہیرو اور میر جعفر کو غدار قرار دیا جانے لگا۔ اگر اسی فارمولے پر اُس وقت کی سیاسی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو نوابوں اور رئیس زادوں کی سیاسی تبدیلیاں معمولی واقعے سے زیادہ دکھائی نہیں دیں گی۔ کیوں کہ یہ آئے روز کا مسئلہ تھا۔ برصغیر ہندوستان کے وسیع عریض خطے میں چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں نواب ایک دوسرے کو فتح کرتے رہتے۔

ڈاکٹر جالبی نے غالب کے اجداد کی تفصیل بتاتے ہوئے انھیں مختلف ریاستی مفادات کا محافظ بتایا ہے۔ یہاں اُن کے بیان کو نکات میں تقسیم کر کے پیش کیا جارہا ہے:

> ”۱۔ عبد اللہ بیگ کی وفات کے بعد ان بچوں کی کفالت اور نگہداشت اُن کے چچا نصر اللہ خاں کے ذمہ ہوگئی۔ نصر اللہ بیگ اس وقت مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے صوبے دار تھے اور جنرل لیک نے آگرہ پر حملہ کیا تو انھوں نے بغیر جنگ کے ہتھیار ڈال دیے۔
>
> ۲۔ غالباً یہ معاملہ نواب احمد بخش خان بہادر رستم جنگ رئیس فیروز پور جھرو کہ و جاگیر دار لوہارو، جو نصر اللہ بیگ خاں کے سالے اور انگریزوں کے نہایت وفادار تھے، پہلے سے طے ہو گیا تھا۔
>
> ۳۔ انھوں نے جنرل لیک سے کہہ کر نصر اللہ بیگ خان کو انگریزی فوج میں چار سو سوار کی رسالداری کا منصب دلوایا۔“
>
> ۴۔ میرا زنوشہ (غالب) کا بچپن ننھیال میں گزارا۔ اُن کے والد عبد اللہ بیگ خان بھی اپنی سسرال میں رہتے تھے اور گھر داماد تھے۔ والد اور چچا کی وفات کے بعد بھی ان کو یتیمی کے مصائب نہیں جھیلنے پڑے۔ سرکاری وظیفہ بھی تھا اور صاحبِ امارت ننھیال کی پُشت پناہی

بھی حاصل تھی۔

۵۔ راجہ الور نے بھی عبد اللہ بیگ کی لڑائی میں مارے جانے کے بعد خاندان کے پرورش کے لیے روزینہ مقرر کر دیا تھا اور ساتھ ہی دو سیر حاصل گائوں بھی ان کے ورثا کو دے دیے تھے۔"(۴)

یہاں ایک شخص کی داخلی اور خارجی کیفیات کے نفسیاتی پس منظر کا بآسانی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ نمبر ا میں دیکھیے: چچا نصر اللہ مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے صوبیدار تھے۔ جب انگریزوں نے آگرہ پر حملہ کیا، تو انھوں نے بغیر کسی مزاحمت اور جنگ کے ہتھیار ڈال دیے اور انگریزوں سے جا ملے۔ غالبیات میں اس اہم سیاسی تبدیلی پر غور نہیں کیا گیا۔ غالب کے سوانح نگاروں نے اسے محض ایک سیاسی تبدیلی قرار دیا ہے حالاں کہ ہتھیار ڈالنے سے لے کر انگریزوں کے قلعہ دار بننے تک کا عمل صرف سیاسی نہیں بلکہ اُس وقت کی سماجی تبدیلی کو قبول کرنے کا عندیہ بھی دیتا ہے۔ یہی کچھ سراج الدولہ کے وزیر میر جعفر نے بھی کیا تھا، جو انگریزوں کے حملے کے وقت پلاسی کے میدان میں غیر جانب دار رہے اور سراج الدولہ کی شکست کا انتظار کرتے رہے۔ اسی طرح نصر اللہ بیگ نے بھی انگریزوں کی آمد کی اطلاع ملتے ہی ہتھیار ڈال کر جنرل لیک کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ یہ کوئی اچانک پیش آنے والا واقعہ نہیں تھا۔ نمبر ۲ میں دیکھیے: ہتھیار ڈالنے کا معاملہ نصر اللہ بیگ اور ان کے سالے نواب احمد بخش خان کے درمیان پہلے ہی طے پا چکا تھا۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ نواب احمد بخش پہلے ہی انگریزوں کے وفادار تھے۔ انھوں نے نہ صرف نصر اللہ بیگ سے ہتھیار ڈلوائے بلکہ ان کے لیے چار سو سواروں کی رسالداری کا منصب بھی حاصل کیا۔ غالب نے پینشن کے مقدمے کے عرضی دعوے میں خود لکھا ہے:

"جب انگریزی فوج نے اس علاقے میں پیش قدمی کی تو نصر اللہ بیگ خاں نے ہتھیار ڈال دیے اور انگریزی حکومت سے مل گئے۔"(۵)

اگر انگریزوں کی آگرہ آمد سے پہلے کی صورتِ حال کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ چچا نصر اللہ بیگ مرہٹوں کے صوبے دار جب کہ بیوی کے چچا نواب احمد بخش انگریزوں کے خطاب یافتہ اور جاگیر دار تھے۔ دونوں کی ہم دردیاں دو الگ سیاسی راجدھانیوں سے تھیں۔ اگر غالب کے والد جو ان کی پیدائش کے دو سال بعد ہی وفات پا گئے ایک اور راجدھانی سے منسلک تھے۔ غالب کے والد عبد اللہ بیگ خان جب لڑائی میں قتل ہوئے، اس وقت ریاست الور، راجھستان کے نواب کے ہاں ملازم تھے۔ غالب خود لکھتے ہیں:

”باپ میرا عبد اللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ جاکے نواب آصف الدولہ کا نوکر ہوا۔ بعد میں چند روز حیدر آباد جاکر نواب نظام الدولہ کا نوکر ہوا۔ تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑوں میں جاتی رہی۔ والد نے گھر آکر گھبر کر الور کا قصد کیا اور راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔“(۶)

نمبر ۳ میں دیکھیے: یہ واقعہ محض ایک عسکری تقرری نہیں تھا بلکہ اس بات کی علامت ہے کہ نصر اللہ بیگ اور ان کے خاندان نے انگریزوں کے ساتھ مفاہمت کر لی تھی اور یہ سب نواب احمد بخش کی پشت پناہی اور انگریزوں سے قربت کی وجہ سے ممکن ہوا۔ نمبر ۴ اور ۵ میں دیکھیے؛ ابتدائی ایام میں غالب کو کسی قسم کی مشقت یا الگ سے معاش کی جگہ نہیں بنانی پڑی۔ وہ اُسی تسلسل میں جو اجداد کی طرف سے انھیں ورثہ کی شکل میں ملا اُسی پر گزارہ کرتے رہے۔ راجہ الور نے بھی ان کا روزینہ مقرر کر دیا تھا۔

غالب کے خاندانی روابط میں مرہٹے، انگریز، راجے اور مغل شامل تھے۔ یہ محض روابط ہی نہیں تھے بلکہ ان طاقت ور خاندانوں کی رسم ورواج اور ان کی تہذیبوں کو ایک سمجھنے کی تربیت بھی تھی جو غالب کو ورثہ میں ملی۔ ان روابط کو معاش تک محدود سمجھنا بھی غلطی ہوگی۔ یہ رئیس جاگیر، صوبے داری، رسالداری اور قلعداری سطح کی اہم ذمہ داریاں تھیں۔ سلیم احمد کو غالب کی زندگی سمجھنے میں سخت غلطی ہوئی۔ وہ غالب کی شخصیت میں رئیس زادگی کے احساس کو زعم قرار دیتے ہیں۔ ”رئیس زادگی کے زعم میں ترکمانی، افرسیابی اور ایبکی فریدونی سب بنا تھا مگر غلام حسین کمیدان کی جائیداد بِک جاتی ہے۔ سات سو روپے سالانہ میں شراب کباب کا خرچ بھی نہیں چلتا۔ قرض ادھار پر زندگی بسر ہوتی ہے۔ انا کہتی ہے ہائے افسوس کس زمانے میں پیدا ہوئے۔“(۷)۔ غالب تک رئیس زادگی کا احساس ضرور پہنچا، اگر رئیس زادگی نہیں پہنچی تھی۔ ایک نسل پیشتر طاقت اور جوڑ توڑ کا مرکز جو خاندان رہا، وہ آگے منتقل ہونے سے رُک گیا تھا۔ طاقت اور اختیار کی سیاست آگے منتقل نہ بھی ہو اس کا احساس معمولی نوعیت کا نہیں ہوتا۔ غالب کا خاندان زمین زادوں سے زیاد، طاقت کے سرچشموں کا حلیف رہا جن کے زیرِ نگیں یہ زمین زادے ہوتے تھے۔ جب رئیس زادگی کی بجائے محض تصور رئیس زادگی شخصیت میں موجود رہ جائے تو یہ نفسی طور پر شدید کشمکش کا باعث بنتا ہے۔ کسی چیز کا احساس موجود ہو مگر اُس کی موجودگی ناممکن ہو تو شخصی سطح پر دولخت کردار بنتا ہے۔ غالب کی رئیس زادگی سے انکار نفسیاتی گرہوں کو مزید پیچیدہ کرنے کے مترادف ہے۔

مغل سلطنت (اُس وقت کا انتظامی ڈھانچہ) مرکزی سلطنت سے انتظام چلانے کی بجائے صوبائی انتظامیہ پر انحصار

کرتی۔ یہ انتظامیہ صوبے، سرکار، پرگنہ اور گائوں پر مشتمل ہوتی۔ پورا ملک مختلف صوبوں میں تقسیم ہوتا۔ ہر صوبے کو سرکاروں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ ہر سرکار میں کئی پرگنے ہوتے۔ جب کہ پرگنے میں کئی گائوں شامل ہوتے۔ صوبے کا انتظامی سربراہ 'صوبے دار' کہلاتا۔ 'سرکار' کے افسرِ اعلیٰ کو 'فوج دار' کہتے۔ جب کہ پرگنے کا منتظم 'عامل' کہلاتا۔ صوبے دار مرکزی حکومت کی ریڑھ کی ہڈی تصور کیا جاتا۔ اسے بادشاہ کا نائب بھی کہا جاتا۔ اسے بادشاہ خود نامزد کرتا تھا۔ اس کے پاس مالیہ کی وصولی کے علاوہ بے پناہ اختیار ہوتے۔ بادشاہ کا نائب ہونے کی وجہ سے پورے صوبے میں بادشاہ کے اختیارات بھی استعمال کرتا۔ اسی طرح پرگنے کا سربراہ 'عامل' بھی مختلف گائوں پر حکومت کرتا۔ اُس کے انتظامی اختیارات میں مالیہ وصولی اور امن و امان قائم رکھنے کے علاوہ حکومتی احکامات کی عمل داری کو یقینی بنانا ہوتا۔

غالب کے نانا غلام حسین خان بھی فوج سے وابستہ رہے۔ شمال کی سیاسی تاریخ میں فوج داروں کی سیاسی وابستگیاں قومی کی بجائے ریاستی ہوتیں۔ رنگ، مذہب یا نسل کی بجائے مفاد کی ظاہری حالت کو ترجیح دی۔ نصر اللہ بیگ جن مرہٹوں کے صوبے دار تھے وہ رہیلوں سے لڑتے رہے۔ روہیلے مغلوں سے بر سرِ پیکار رہے۔ غلام قادر روہیلہ جس نے مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکالیں، اس کا باپ پہلے اسی بادشاہ کا عہدہ دار تھا۔ غالب کی انگریزوں کی قصیدہ خوانی کو قومی رنگ میں دیکھنے سے فکری اغلاط پیدا ہوئیں، وہیں سوانح نگار یہ بھول گئے کہ غالب نے ۱۸۶۰ میں جو قصیدہ راجا شیو پرشاد دھیان سنگھ، والیٔ الور کی شان میں لکھا تھا اس میں بھی اپنے والد کے میدانِ جنگ میں مارے جانے کا ذکر کر کے اپنی قدیم نیاز مندی کی شہادت دی ہے۔(۸) یہ وہی ریاست تھی جہاں غالب کے والد عبد اللہ بیگ تلاشِ روزگار کے سلسلے میں ۱۸۰۲ میں پہنچے۔ ریاست کے راجہ بختیار سنگھ نے ایک باغی زمیندار کی سرکوبی کے لیے ایک فوجی دستہ بھیجا جس میں عبد اللہ بیگ بھی شامل تھے۔ اس جھڑپ میں عبد اللہ بیگ مارے گئے۔ غالب کا الور کی ریاست اور اس کے نوابوں سے عمر کے آخری وقت تک رابطہ رہا۔ حالی لکھتے ہیں:

> ''غالب اس انقلاب(۱۸۵۷) میں ایک مبصر کی حیثیت سے شریک نظر آتے ہیں۔ جس محلے میں وہ رہتے تھے، اس کی حفاظت، انگریز کی اجازت سے راجہ الور کے سپاہی کر رہے تھے۔''(۹)

لہٰذا جب غالب یہ کہتے ہیں کہ جب سے منہ میں دانت نکلے ہیں، ان فاتحینِ عالم کے دستر خوان کا ریزہ چین ہوں، تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہ فکری اور شخصی بُعد کا شکار تھے۔ کہتے کچھ تھے اور کرتے کچھ۔

ان حقائق کی روشنی میں غالب کو ایک تاریخی شعور رکھنے والے حقیقت پسند مفکر کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے جو اپنے

زمانے کی سیاسی، سماجی اور اخلاقی پیچیدگیوں کو جذباتی یا نظریاتی تعصب سے نہیں بلکہ گہرے شعور، تجربے اور فرد و سماج کے باہمی تعلق کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔

## حوالہ جات


1. https://www.newworldencyclopedia.org/entry/Siraj_ud-Daulah
2. https://www.britannica.com/event/Battle-of-Plassey

۳۔ ایضاً

۴۔ جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد چہارم، مجلسِ ترقی اردو، لاہور، ۲۰۱۵، ص ۴۱، ۴۲

۵۔ کالی داس گپتا رضا، غالب درونِ خانہ، انجمن ترقی اردو، کراچی، ص ۱۳

۶۔ خواجہ حسن نظامی، غالب کا روزنامچۂ غدر ۱۸۵۷ء، ص ۲۴

۷۔ سلیم احمد، غالب کون؟ ص ۶۰

۸۔ تاریخِ ادبِ اردو، جلد چہارم، ص ۴۰

۹۔ ایضاً، ص ۲۹